

خلیل طوق آر

مہمبی سے پشاورتک منزل بہ منزل ہمدستان
(ایک عثمانی سفیر احمد شیری شیروانی کی زبانی)^۱

ہندستان یا پاکستان کی نسبت ترکی ادب میں سفرنامہ لکھنے کا رواج کم ہے۔ یہ کل ایسا تھا اور آج بھی تقریباً ایسا ہی ہے۔ شاید ترکوں کی خانہ بدوش زندگی کی وجہ سے، جو صدیوں سے جاری تھی، ترکی کے لوگ کسی دوسرے کی کہانیاں پڑھنے کی بجائے خود جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی عادت رکھتے تھے اور شاید ترکی تاریخ کے طول و عرض میں جو جنگوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا اُس نے لوگوں کو فرصت ہی نہیں دی کہ وہ اس طرح کی ادبی اصناف کی طرف زیادہ مائل ہو سکیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ترکی ادب میں صنف سفرنامہ سرے سے نہیں ہے، بے شک ترکی ادب میں صنف سفرنامہ ہے، مختلف سفرنامہ نویس بھی ہیں لیکن سفرنامہ نویسوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں جتنی اردو ادب میں ہے۔ ترکی زبان میں شروع شروع میں عثمانی سفیروں کی رپورٹوں اور خطوط کی صورت میں شروع ہونے والی سفرنامہ نویسی کا سلسلہ آگے چل کر ایک باقاعدہ صنف ادب کی صورت اختیار کرنے لگا اور بالخصوص انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر آج تک یہ صنف ترقی کرتی رہی ہے۔^۲

ترکی ادب کے اولین سفرناموں میں خواجہ غیاث الدین نقاش کا عجائب اللطائف نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ سیدی علی رئیس کی تصنیف مرآة الممالک، اولیا چلبی کی معروف تصنیف سیاحت نامہ اور کاتب چلبی کی تصنیف جہان نما اور طوقادلی ابراہیم اوغلو احمد کی تصنیف عجائب نامہ ہندستان کے نام بھی ترکی سفرناموں کی فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ ہمارے موضوع سے رابطے کی وجہ سے ان میں سے دو آخری سفرناموں کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے کیونکہ ان دونوں سفرناموں میں برصغیر اور خاص طور پر ہندستان کے بارے میں تفصیلی معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ان مختلف سفرناموں کے بعد بھی ترکی ادب میں دوسرے سفرنامے بھی لکھے گئے لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر، مثلاً یہی کہ مسافروں اور مصنفوں کی توجہ نے مغرب کی جانب رخ کر لیا تھا، اکثر و بیشتر سفرنامے مغرب کے بارے میں لکھے گئے۔^۳

لیکن جب عبدالحمید ثانی کا عہد آپہنچا تو عثمانی سیاست کے ساتھ ساتھ مغرب و مشرق کے تعلقات کا توازن بھی مشرق کے حق میں بدلنے لگا کیونکہ عبدالحمید ثانی برسرِ اقتدار آنے کے بعد ایک نئی پالیسی اپنانے میں لگے تھے اور اُس پالیسی کا نام تھا ”اتحاد اسلام پالیسی“۔

سلطان عبدالحمید ثانی نے جس مہلک اور وحشت انگیز عہد میں زمامِ سلطنت سنبھالی تھی اس میں انہیں جس گزرگاہ سے آگے بڑھنا تھا وہ بظاہر پُر خار و پُر خطر تھی اور اس میں انہیں اپنے دشمنوں کے ایک وسیع محاذ سے نبرد آزما ہونا لازمی تھا۔ اس محاذ میں، خاص طور پر، یورپ کی استعماری قوتیں شامل تھیں جو انہیں اپنا سب سے خطرناک حریف اور عیسائیت کا دشمن ٹھہراتی تھیں۔ ویسے بھی عبدالحمید ثانی کے سامنے اتحادِ اسلامی پالیسی کو اپنانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس ضمن میں عزمی اوزجان لکھتے ہیں:

”ان تمام واقعات کی زد میں سلطان عبدالحمید ثانی کیا کر سکتے تھے؟ اُن کے ہاتھ میں جو سب سے بااثر اسلحہ تھا وہ بین اسلام ازم تھا۔ اس طرح شاید انھوں نے مجبور ہو کر کم از کم سلطنت کے اندر موجود مسلمان عناصر کی یکجہتی کو مضبوط کر کے سلطنت کا اتحاد قائم رکھنے کی خاطر اس اسلحے کو استعمال کیا۔ لہذا سلطان عبدالحمید بھی یہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام میں اُن کا جواثر و رسوخ تھا اُسی کو مضبوط و محکم کر کے مسلمانوں کو میدانِ جدوجہد میں لائیں، اور بالخصوص جن ممالک کے زیرِ حکومت کثیر تعداد میں مسلمان آبادی موجود ہے اُس کے ذریعے اپنے دشمنوں سے مقابلے کی صلاحیت پیدا کریں۔ علاوہ ازیں، ۱۲۹۳ھ بمطابق ۱۸۷۶ء میں روس سے لڑی جانے والی جنگ کے دوران عالم اسلام میں عثمانیوں کے حق میں ظہور پذیر ہونے والے جوش و خروش اور باہمی ہمدردی کے جذبات کا اظہار اُن کو شوق دلاتا تھا کہ وہ اس قسم کے حساب کتاب کا پروگرام بنائیں۔“^۴

عبدالحمید کی اس پالیسی کی اندرون ملک اور بیرون ملک سخت مخالفت کی گئی لیکن ان نامساعد حالات کے باوجود، جن سے وہ اچھی طرح واقف تھے، وہ اپنے راستے پر ثابت قدم رہے۔ اب اُن کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اتحادِ اسلامی پالیسی کو بروئے کار لانے کے لیے کیا کیا لائحہ عمل اپنایا جائے؟ اس ضمن میں انھوں نے مختلف اقدامات اختیار کئے۔ ان میں دو اقدامات ایسے تھے جن کا تعلق زیادہ تر مسلمانانِ ہند سے تھا اور جب ژون ترکلر (Young Turks) نامی حریت پسند عثمانیوں نے سلطان عبدالحمید خان کا خلع کر دیا اور اتحاد و ترقی پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو انھوں نے بھی بادشاہ کے اُن اقدامات ہی کی پیروی کی۔ وہ دو اقدامات یہ تھے: (۱) ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں کثیر تعداد میں قونصلوں (جو عثمانی زبان میں شہبندر کہلاتے تھے) کا تقرر، اور (۲) صحافت کے ہمہ گیر اور کارگر اثرات سے استفادہ۔

عبدالحمید ثانی سے پیشتر ممبئی میں عثمانی سفارتخانہ موجود تھا لیکن سلطان موصوف کی تخت نشینی کے بعد،

خاص طور پر، ۱۸۸۲ء کے بعد یکا یک اُن کی تعداد میں اضافہ ہوتا نظر آتا ہے۔ ۱۸۷۷ء میں پشاور میں عثمانی قونصل خانے کے قیام کی غرض سے کوششیں کی گئیں جو حکومت ہند کی طرف سے مسترد کر دی گئیں۔ پھر حکومت عثمانی نے ایک اور اقدام کیا۔ یہ کہ سرکاری سفیروں کے بجائے اہل ہند سے منتخب اعزازی سفیروں کا تقرر کیا جائے۔ اس طرح نہ حکومت عثمانی پر مالی بوجھ پڑتا تھا اور نہ ہی ان اعزازی قونصلوں کی کارروائیوں سے عثمانی حکومت براہ راست ملوث قرار دی جاسکتی تھی۔ اس پر عمل ہونے لگا اور کراچی اور مدراس کی مانند ہندستان کے اہم مراکز میں قونصل خانے قائم کئے گئے۔ یہ قونصل خانے حسب ضرورت مالی و معنوی امداد کی فراہمی اور اتحاد اسلامی کے افکار کی نشر و اشاعت میں کافی کارآمد ثابت ہوئے۔ لیکن ان کی کارکردگیوں پر انگریزوں کی کڑی نظر مرکوز رہتی تھی۔ بعد کے سالوں میں جب دنیا پہلی جنگ عظیم کی طرف جارہی تھی تو ان کی کارروائیوں کی روک تھام کی کوششیں ہوئیں۔ ۵

دوسرا اقدام جو صحافت کے ذریعے اتحاد اسلامی کے افکار کو زیادہ وسعت دے کر عثمانیوں کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے کیا گیا تھا، وہ شاید پہلے کی نسبت زیادہ پُر اثر تھا۔ اس لیے کہ اخباروں کا حلقہ اثر وسیع تر ہوتا ہے اور ان کے ذریعے لوگوں کی کثیر تعداد تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے۔ اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلقات کو مزید آگے بڑھانے کے لیے باب عالی (عثمانی پارلیمنٹ) نے ایک نیا قدم اٹھایا۔ وہ یہ تھا کہ استنبول سے اردو اخبار شائع کئے جائیں، اور یہ اقدام عثمانی دارالخلافہ استنبول میں اردو صحافت کے وجود میں آنے کا باعث بنا۔

ان کے علاوہ ایک اور اقدام بھی تھا، مختلف علاقوں کو فرستادہ سفیروں یا سول سروس کے لوگوں سے وہاں کے متعلق رپورٹ یا سفرنامہ لکھوانا۔ ہر چند یہ آخری اقدام دوسروں کی نسبت بظاہر کم اہمیت رکھتا تھا لیکن ایک ایسا زمانہ جس میں نہ ٹی وی تھا نہ ویڈیو، اُس میں اجنبی خطوں کو پہچاننے کا واحد ذریعہ سفیروں کی رپورٹیں، خطوط اور سفرنامے تھا۔ ان میں سے ایک ترکی کے سفارتی وفد کے ایک ممبر احمد حمی شیروانی کا ”سفرنامہ ہندستان، سوات و افغانستان“ تھا۔

اب اس سفرنامے اور اُس میں موجود ہندستان اور ہندستان کی تہذیب سے متعلق گفتگو شروع کرنے سے قبل ہم یہاں احمد حمی شیروانی کون ہیں؟ ذرا اس بارے میں معلومات فراہم کریں گے اور پھر اپنے موضوع کی طرف آئیں گے۔

احمد حمی شیروانی، ۱۸۲۸ء میں بحر خزر کے کنارے ایک تاریخی شہر شیروان میں پیدا ہوئے۔ بعد میں وہ

استنبول آئے جہاں اپنی پوری تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ہرچند اُن کی استنبول آمد کی تاریخ کا صحیح علم نہیں ہے لیکن چونکہ اُنھوں نے اپنی پوری تعلیم اڈل سے آخر تک استنبول میں حاصل کی لہذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ بچپن یا غفوان شباب کے شروع میں یہاں آکر اقامت اختیار کر چکے ہوں گے۔ احمد حمّی آفندی حصول تعلیم کے بعد مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور اس دوران متعدد کتابیں قلمبند کیں، جن میں ترجمۂ مقاماتِ حریری، اصول فقہ، جغرافیائے کبیر اور اصول جغرافیہ مشہور ہیں۔^۶

ان مختصری معلومات کے بعد جب ہم اس سفر کی طرف آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جب سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد میں عثمانیوں اور روس کے مابین جنگ جاری تھی، یہ فیصلہ طے پایا کہ حکومت عثمانی کا ایک وفد افغانستان روانہ کیا جائے تاکہ جاریہ جنگ کے دوران روس کے خلاف افغانستان کی مدد حاصل کی جائے اور افغانستان سے روس پر حملہ کرا کر دوسرا محاذ قائم کیا جائے اور اس طرح روس کی فوج تقسیم ہو جائے۔ اس غرض سے باصلاحیت اور تجربہ کار ارکانِ دولت میں سے چند افراد پر مشتمل ایک وفد، جن میں احمد حمّی آفندی بھی شامل تھے، تیار کیا گیا۔ وفد کی افغانستان سلامتی سے رسائی کے لیے پُر امن راستے کی ضرورت تھی۔ اسی لیے ہندستان کا راستہ منتخب کیا گیا، کیونکہ جہاں ایک طرف انگلستان اور دولت عثمانی کی دوستی اپنے عروج پر تھی، وہاں دوسری طرف اس طوفانی عہد میں عثمانی وفد کے لیے ہندستان ہی امن و سلامتی سے کابل پہنچنے کی واحد راہ تھا۔

۱۸۷۸ء میں یہ وفد ایک برطانوی بحری جہاز میں استنبول سے روانہ ہوا اور ترکی کی چند بندرگاہوں سمرا (ازمیر) اور چشمہ اور بحر روم کے چند جزیروں میں رکتار کا تاسفر کے ساتویں روز مصر کے شہر اسکندریہ پہنچا۔ اس وفد کے ممبر کچھ دن اسکندریہ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کے بعد ریل گاڑی سے سویس (Suez Canal) پہنچ کر رات کو کسی انگریزی کمپنی کے بحری جہاز میں سوار ہوئے۔ احمد حمّی آفندی کے کہنے کے مطابق اُن کے علاوہ جہاز میں کچھ انگریز مسافر بھی تھے۔ سفر کے دوران انگریز مسافروں کی وفد کے ممبروں سے دوستانہ گفتگوئیں اور تبادلہ خیالات بھی ہوئے۔ اس دوران احمد حمّی آفندی نے جہاز میں موجود انگریزوں کی حرکتوں کا مشاہدہ بھی کیا اور سمندر کے طوفانی دنوں میں اُن کا بیابانہ اور بعد کی شدید گرمیوں میں آرام سے پانچ بجے کی چائے پینا دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور اُن کے صبر و تحمل کی داد بھی دی۔ جہاز پہلے عدن اور پھر عدن سے سات روز و سب کی مسافت کے بعد ممبئی کے ساحل پر وارد ہوا (صفحہ ۱۲۳۹)۔

ممبئی آنے کے بعد احمد حمّی اس شہر کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندوؤں کا اپنی میتوں کو جلانا اور یارسیوں کا اپنی میتوں کے جسموں کو چیل اور گدھوں کی نذر کرنا، بمبئی کی سڑکیں، اہم عمارتیں، یہ سب باتیں احمد

حمدی کی زبانی نہایت عمدہ طریقے سے پیش کی گئی ہیں۔ لیکن جب شہر کے لوگ عثمانی وفد سے اپنی محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو یہ انگریزی حکام کو بہت ناگوار گزرتا ہے اور فی الفور عثمانی وفد کو ریل گاڑی میں بیٹھا کر شہر سے نکال دیتے ہیں۔ وفد جبل پورہ سے الہ آباد اور وہاں سے بنارس پہنچتا ہے۔ احمد حمی آفندی کی دی ہوئی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ بنارس اُن کو پسند آیا تھا کیونکہ سفر نامہ کے آٹھ صفحوں میں بنارس کی عمارتوں، مندروں اور ہندو زائین اور ان کی عبادات اور رسم و رواج کا ذکر ملتا ہے (صفحہ ۱۲ تا ۱۷)۔

یہاں سے وفد الہ آباد سے شمال مغرب میں جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہو کر چار گھنٹے کے بعد کانپور پہنچتا ہے۔ احمد حمی کانپور کی آب و ہوا اور طبعی خوبصورتی کی تعریف کرنے کے بعد غدر کے زمانے میں کانپور میں رونما ہونے والے المناک حادثات اور نانا راؤ صاحب کے خلاف انگریزوں کے الزامات نقل کرتے ہیں اور کانپور کی سیر کرتے ہوئے جب اپنے ساتھی انگریز کے ساتھ ایک باغیچے میں جاتے ہیں تو باغیچے میں غدر میں مقتول انگریزوں کے یادگار مجسمہ کے نیچے بیٹھ کر غصے اور نفرت بھرے یاس دالم کے لہجے میں اس کے رونے کا ذکر بھی کرتے ہیں (صفحہ ۴۴ تا ۴۶)۔

جہاں تک اس تصنیف کے اگلے اوراق سے معلوم ہوتا ہے، اس سفر کے دوران ہی وفد کانپور سے لکھنؤ کا دورہ بھی کر آیا: ”کانپور سے ریل گاڑی کے ذریعے مشرق میں واقع اور مذکورہ شہر سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ولایت اودھ کے قدیم پائے تخت لکھنؤ پہنچے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں اس شہر جیسے بڑے شہر کم پائے جاتے ہیں اور پہلی نظر میں انسان کو فرحت بخشنے والے لکھنؤ جیسے شہر معدوم کا عدم ہیں“ (صفحہ ۷۷)۔

اس کے علاوہ احمد حمی لکھنؤ کی سرسبزی، امام باڑہ، آصف الدولہ، چتر منزل، قیصر باغ کی عمارتوں اور باغیچوں کی لطافت اور طراوت کی باتیں بڑے دلکش انداز میں کرتے ہیں۔

وہ کانپور سے دہلی کی جانب سفر کی کہانیاں طرح بیان کرتے ہیں: ”کانپور سے مغرب کی طرف سفر کے لیے ریل گاڑی میں سوار ہو کر آگرہ پہنچے۔ دوسرے دن صبح دنیا کی عجوبہ عمارتوں میں تاج گنج، تاج محل، تاج بی بی یا ممتاز محل نامی مشہور ملکہ کے عنوان سے معنون مشہور تربت کی زیارت کی نیت سے گئے (صفحہ ۸۹)۔

آگے چل کر شاہ جہاں اور ممتاز محل کی زندگی اور عشق کی کہانی اور تاج محل کی خوبصورتی، تاریخ عمارت، طرز تعمیر، وغیرہ کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ بعد ازاں، مقبرہ اکبر شاہ، جہانگیر کے کنارے واقع شاہ جہاں کے محل کا ذکر آتا ہے اور اکبر شاہ کے مقبرے کی زیارت کرتے ہوئے مزار کے اوپر نصب شدہ سنگ سیاہ میں سفید رنگ سے مرقوم مثنوی کے ابیات بھی تحریر کیے جاتے ہیں۔ اس مثنوی کے آخری ابیات جس میں موت اور زندگی کی

حقیقت مضمر ہے، وہ یوں ہیں:

چو از عدل آباد کرد این جهان
سوئے آن جهان رفت روشن روان
شہ ہفت کشور درین دہر بود
کنون ہشت جنت مسکر نمود
نماند کیبیتی کسی جادوان
ز دست اجل کس نبرد جان
(صفحہ ۵۳ تا ۵۴)

کتاب میں آگرہ کے بعد دہلی کی باری آتی ہے لیکن احمد حمادی رقمطراز ہیں کہ ہم یہاں دہلی کے بارے میں کچھ قلمبند کر رہے ہیں لیکن ہم دہلی پشاور جاتے ہوئے نہیں بلکہ پشاور سے واپسی کے وقت آئے۔ دہلی کے بارے میں کہتے ہیں:

دنیا کی کسی بھی جگہ اس طرح کے آثارِ عقیدہ کا مجمع دیکھنے میں نہیں آتا۔ دہلی اس کی حقدار ہے کہ وہ ہندستان کے آثارِ عقیدہ کا عجائب گھر کہلائے، کیونکہ جہاں بھی نگاہ دوڑائیں کسی نہ کسی تاریخی عمارت سے نظر جاکراتی ہے۔ قلم اس شہرِ نفیس کی توصیف سے یکسر عاجز ہے۔ مثلاً پرانے شہر میں واقع ”باب علاء الدین“ کی توصیف ہی کیا ممکن ہے! یہ دورازہ ۱۳۱۰ء میں یعنی ۵۷۲ برس قبل قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے تعمیر کردہ باغ کے مدخل میں وضع کیا گیا تھا۔... مزید براں، آثارِ نفیسہ، جو لگتا ہے کہ سلاطین دہلی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں، اندلس کے الحراء کی اُن سے کیا نسبت! (صفحہ ۶۰)

دہلی کے آثارِ عقیدہ کے علاوہ، کتاب میں امیر خسرو دہلوی کی زندگی، اُن کی آخری آرام گاہ اور سلاطین دہلی کی تاریخ کے بارے میں معلومات بھی موجود ہیں۔

احمد حمادی وفد کے دیگر ممبروں کے ہمراہ علی گڑھ بھی دہلی ہی کی طرح پشاور سے واپسی پر آئے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ علی گڑھ میں سرسید احمد خان سے اُن کی ملاقات ہوتی ہے۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

واپسی پر سر ہند سے دہلی جاتے ہوئے جب ہم ریل گاڑی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کسی بوگی میں سید احمد خان نامی ایک سفید ریش آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ انگریزوں نے ہمارے لیے شخص کی گئی بوگی میں ایک ایسے اجنبی کو در آنے کی اجازت کیسے دی؟ پھر معلوم ہوا کہ یہ آدمی دہلی کے معروف خاندانوں میں سے ایک سے منسلک ایک معتبر شخص ہے اور انگریزی حکومت کی نظر میں باعتبار ہونے کی بنا پر ایک ایسے مقام پر پہنچا

ہے جس تک اس کے ہم عصر اور ہم درجہ افراد نہ پہنچ سکے۔ مذکور احمد خان یہ گزارش لے کر آئے تھے کہ علی گڑھ نامی اسٹیشن پر اتر کر ان کے قائم کردہ کالج کو دیکھیں، کیونکہ انہوں نے اس مقصد کے لیے حکومت سے اجازت حاصل کی تھی۔ مذکورہ اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سوار ہوئے۔

الغرض اسی کالج میں جا کر طالب علموں سے اپنے درسوں سے متعلق سوال و جواب کرنے کے بعد سر سید احمد خان نے اردو زبان میں ایک عمدہ تقریر کی جو حضرت سلطان امیر المؤمنین اور ملکہ انگلستان کی دعا پر حاوی تھی۔

(صفحہ ۹۹۸-۹۹۹)

وفد کے ممبر علی گڑھ سے امرتسر اور وہاں سے لاہور آتے ہیں، احمد حمیدی امرتسر کے بازار و مساجد اور بالخصوص دربار صاحب کی خصوصیات بتاتے ہیں اور لاہور میں شاہی قلعہ، انارکلی، بادشاہی مسجد اور شالامار باغ کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ شاہی قلعہ کے متعلق رقمطراز ہیں: ”قصر مذکور کے ایک کمرے میں متبرکات شریفہ پائی جاتی ہیں جن میں فخر کائنات علیہ افضل التحیات رسول اکرم کا سبز عمامہ (عمامہ شریفہ) اور مشہور قضیب شریف یعنی آپ ﷺ کا عصا شامل ہیں...“ (صفحہ ۱۰۹)۔ مزید براں، حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی پگڑیوں کی زبوں حالی کے بارے یوں اظہارِ افسوس کرتے ہیں: ”افسوس کا مقام ہے کہ مذکورہ امانت ہائے شریفہ کمرے کے درمیان ہی ایک شیشہ کی اونچی الماری کے اندر رکھی ہوئی پڑی ہیں“ (ایضاً)۔

پھر ممبران وفد لاہور سے ریل گاڑی کے ذریعے جہلم پہنچتے ہیں۔ بعد کے سفر کے بارے میں احمد حمیدی بتاتے ہیں کہ ”جہلم سے آگے پشاور تک کی ریل گاڑی کی لائن نہیں تھی۔ اس لیے کچی اینٹوں کا راستہ بنایا جا رہا تھا۔ سننے میں آتا ہے کہ آگے پڑی مکمل بچھائی چکی ہے اور بوگیوں کی آمد و رفت جاری ہے“ (صفحہ ۱۱۶)۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: ”بذریعہ جہلم سے روالپنڈی پہنچے اور وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔۔۔ انگریز ملازمین کمروں میں کھلے سر اور کوٹ اتارے صرف قمیص پہنے ہوئے میز کے کنارے بیٹھے بیٹھے اپنے اپنے ذمے کا کام کر رہے تھے۔۔۔ سونے کے کمروں کے باہر بیٹھے ہوئے ہندو ملازمین صبح سے شام اور شام سے صبح تک باہر اندر لٹکے ہوئے پنکھوں کی ڈوری کھینچ کر سے ہوا پہنچاتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود چھوٹی چھوٹی مکھیوں کے کاٹنے کی وجہ سے آرام سے سونا محال ہو گیا تھا“ (صفحہ ۱۲۰)

روالپنڈی میں تین دن اقامت کے دوران سوات جانے کے خطرے اور ہلاکت آور پہلو پر گفتگو ہوئی۔

اُن دنوں پشاور کا کمشنر کبیر مسٹر بانگ روالپنڈی میں قیام پذیر تھا۔ مشارالہ کی اور روالپنڈی کے انچارج ملازمین اور افسران کی بھی یہی رائے تھی کہ ہم ہوتی مردان چلیں اور وہاں خواجہ محمد خان نامی شخص سے، جو انگریزی حکومت کے نزدیک سوات والوں کا نمائندہ تھا، خود جناب آخوند صاحب کے اور مذکورہ علاقے کے حاکم کے نام

سفارشی خطوط لکھوائیں اور اُس علاقے کے اندرونی حالات سے واقف چند اصحاب کو ہمراہ لے کر آگے عازم سفر ہوں۔ اُسی دن عصر کے وقت ہم دوستوں سے جدا ہوئے اور گجھی میں سوار ہو کر چل پڑے۔ رات کے ایک بجے روالپنڈی سے پینتیس کوس کے فاصلے پر واقع انک نامی قصبے پہنچے۔ یہ قصبہ انک نامی ندی کے کنارے پر ہے جسے وہاں کے لوگ دریائے سندھ کہتے ہیں۔

مذکورہ قصبے میں اس علاقے کے حاکم ٹکڑ خان، یعنی لشکر خان، کے یہاں مہمان ہوئے۔ رات کے دو بجے کھانا کھانے کے بعد دریا کے کنارے آکر ایک بڑی کشتی پر سوار ہوئے جسے کوئی دس بارہ آدمی چپوؤں سے چلا رہے تھے۔ اس علاقے میں پل نہیں تھا۔ جب ہم کشتی پر تھے تو ایک آدمی مسلسل الغوزہ بجاتا رہا۔ دریا کا شدت سے بہنا، کشتی والوں کا شور اور خود الغوزے کی آوازیں اس پرہے آرام کر رہی تھی۔

انک کے ساحل پر اترنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر صبح سویرے نوشہرہ آگئے۔ چونکہ نوشہرہ کی آب و ہوا خوشگوار رہتی ہے اس لیے اگست اور ستمبر کے مہینوں میں آس پاس کے علاقوں کے فوجی آکر نوشہرہ میں خیمہ زن ہو جاتے ہیں۔

نوشہرہ سے ہوتی مردان کے راستے میں مذکورہ قصبے کا تحصیل دار اکبر شاہ اپنے منشی احمد بخش اور ایک ہندو افسر کے ساتھ انگریزی حکومت کے حکم پر قصبے سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہمارا استقبال کرنے آیا تھا۔ اُس کے محل کار میں مہمان ہوئے۔“ (صفحہ ۱۲۲)

نوشہرہ میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد احمد حمادی آفندی نوشہرہ اور اُس قصبے میں آباد لوگوں اور اُن کے رسم و رواج وغیرہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو کے متعلق بھی لکھتے ہیں:

چونکہ زبان اردو حکومت کی سرکاری زبان ہے اس لیے ہندستان میں بہت سارے یومی اردو اخبار چھپتے ہیں اور پوری سرکاری تحریروں میں اردو استعمال ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے سرکاری زبان چونکہ فارسی تھی اور دفاتر میں سرکاری تحریریں فارسی میں ہوا کرتی تھی اس لیے ہندستان میں آج تک اچھی خاصی فارسی بولنے والے انگریز افسر موجود ہیں۔ رہی اردو زبان، تو یہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے الفاظ سے ملو ہے اور اصل اردو عام طور پر ”ہے“، ”ہو“، ”ہوں“ اور کچھ حروف سے عبارت ہے۔

اہل اسلام کے درمیان اردو میں عروض کے مطابق بہت ساری نظمیں اور اشعار کہے گئے ہیں، علاوہ بریں منشور تصانیف بھی بے شمار ہیں۔ (صفحہ ۱۲۶)

عثمانی وفد کچھ دن بعد گھوڑوں پر سوار ہو کر پٹیل نام گاؤں میں جاتا ہے اور شدید گرمی کے سبب اُسی گاؤں میں ٹھہرتا ہے۔ عصر کے وقت مذکورہ گاؤں سے نکل کر ایللی نامی ایک اور گاؤں میں پہنچتا ہے، احمد حمادی آفندی آگے لکھتے ہیں:

غروب کے وقت ہم لوگ مذکورہ گاؤں (ایلی) پہنچے۔ چونکہ یہ علاقہ انگریزی حکومت کی نوآبادیات میں شامل نہیں ہے، لہذا یہ ”علاقہ سوات“ کہلاتا ہے۔ اسی گاؤں کے پرانے خاندان کے تین افراد امام خان، دوست محمد خان اور سر بلند خان کے ہاں مہمان بٹھیرے۔ رات کو اُن کے گھر ہمارا قیام رہا اور علی الصبح سر بلند خاں گاؤں کے باہر تک خدا حافظ کہنے کے لیے آیا۔ الوداع کہہ کر واپس چلا گیا۔ اور ہم شاقو دنامی پہاڑ کی طرف رو آئے ہو گئے۔“ (صفحہ ۱۲۹)

احمد حمادی کے بیان کے مطابق یہ لوگ مذکور پہاڑ کو پار کر کے تین میل کے فاصلے پر واقع دندنامی گاؤں میں شیردل خان سے، جو اہل سوات میں سب سے برجستہ اور دور اندیش آدمی تھا، بعض مسائل پر بحث و مباحثہ کی غرض ملنے جاتے ہیں۔ مذکور خان سے گفتگو کے دوران آخوند صاحب کا داماد مولوی صاحب اُن کے پاس آتا ہے۔ احمد حمادی کے کہنے کے مطابق ہر چند کہ عثمانی وفد کے ممبران اصرار کرتے ہیں کہ وہ اُن کے ہمراہ آخوند صاحب کے پاس چلے، وہ صاف انکار کر کے کہتا ہے کہ ”آپ لوگ بھی سیدوں نہ جائیں کیونکہ آپ لوگ انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں!“ عصر کے وقت وہ لوگ پھر روانہ ہوئے اور پہلے کوتھ نامی قصبے میں اور اس کے بعد سیدوں آ پہنچتے ہیں۔ سیدوں میں ان کی آمد جمعے کے دن ہوئی۔ اس وجہ سے نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد ارکان وفد کی آخوند صاحب سے ملاقات ہوتی ہے۔ احمد حمادی لکھتے ہیں:

اس اثنا میں آخوند صاحب حد درجے کے بیمار، بہت کمزور اور آخری دم لینے کی حالت میں تھے۔ اس کے باوجود لہ الحمد انھوں نے ہمارے بادشاہ کی سلامت و نصرت کی دعا کی۔ واقعتاً مذکور شیخ صاحب سوات سے ہمارے جانے کے فوراً بعد ہی رحلت فرما گئے (ان اللہ وانا الیہ راجعون)۔ انھوں نے مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ انگریزوں کی وساطت سے ہمارے وہاں جانے کا اُن کو بڑا افسوس ہوا ہے۔ گو ہم نے کہا کہ ہم انگریزوں کے مقبوضہ علاقوں کے راستے سے آنے پر مجبور تھے۔ پھر بھی انھوں نے کہا کہ پچھلے دنوں انگریزوں کے بلوچستان پر قبضے کا امیر افغانستان پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ اس لیے ہم انگریزوں سے بہت محتاط رہتے ہیں۔“ (صفحہ ۱۳۵)

آخوند صاحب سے ملاقات کے بعد وفد ہوتی مردان اور وہاں سے پشاور جاتا ہے۔ پشاور میں ممبران کی رہائش کافی دنوں تک رہتی ہے اور پھر وہاں سے یہ لوگ افغانستان پہنچ کر کابل میں امیر افغانستان کے حضور باریابی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن امیر اُن کے ساتھ کافی سردمہری سے پیش آتا ہے اور عثمانی وفد کوئی بھی فائدہ بخش نتیجہ حاصل کیے بغیر پشاور اور پشاور کے بعد ریل گاڑی سے ممبئی واپس آتا ہے۔ ممبئی سے ایک برطانوی کمپنی کے بحری جہاز میں سوار ہو کر حجاز اور وہاں سے استنبول پہنچتا ہے۔

احمد حمادی شیروانی کے سفر کی کچھ جھلکیوں کو پیش کرنے کے بعد جب اس سفر نامے کے اجمالی جائزہ کی طرف آتے ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دوسو صفحے سے زائد اس سفر نامے میں ہندستان سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کو پڑھنے کے بعد انسان کے ذہن میں آج کل کے کمرشلوں کا مشہور عالم نعرہ ”Incredible India“ ابھر آتا ہے! کیونکہ سفر نامے میں ممبئی میں وفد کے قدم رکھنے سے لے کر پھر ممبئی واپس آ کر ہندستان کو الوداع کہنے تک کی جو معلومات موجود ہیں وہ سب اس امر کا مظہر ہیں کہ احمد حمادی نے انیسویں صدی کے ہندستان میں آج کل کے ”Incredible India“ ہی کا نظارہ کیا تھا۔ شہروں کی اہم اہم عمارتیں، سڑکیں، گلیاں، اُن کے گھر، میوزیم، ان سب کا تاریخی پس منظر، شہروں کی رنگ برنگی طرز زندگی، مختلف مذاہب اور اُن کے اعمال و طریقہ عبادت، غرض جو کچھ بھی اس کتاب میں مذکور ہے ایسا لگتا ہے جیسے اس نعرے کی تاثیر کے تحت لکھا گیا ہے۔

مثال کے طور پر ممبئی کو لیجیے۔ احمد حمادی لکھتے ہیں:

ممبئی اٹھارہ درجے پچاس منٹ شمال میں اور ہندستان کے مغرب میں واقع ہے۔ یہ ایک ایسا دلچسپ شہر ہے جو ایک نئی دنیا کہلائے تو اس میں کچھ مذاقہ نہیں۔ اُس کے لوگوں کے چہرے، عادات و رسومات سے یہ امر آشکار ہوتا ہے کہ وہ کس کس گردہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں، اس شہر کے اوپر بارش کم نہیں ہوتی۔ اس لیے ممبئی کے چار اطراف بہشت کی مانند چمن سرسبز، شاداب ہیں اور خوشبوؤں سے مہکتے ہیں۔“ (صفحہ ۱۶)

اس شہر میں ہند، عرب، عجم، پارسی، یورپین، چینی وغیرہ اقوام کے مخصوص علاقے موجود ہیں۔ بڑی پگڑیاں اپنے سروں پر رکھے اور چہروں پر سرخ، پیلی اور نیلی لکیریں لگائے نیم برہنگہ منے والے ہندو، بالی پکڑے پہنے عرب اور شکل کے لحاظ سے ایرانیوں سے مشابہت رکھنے والے لمبی ٹوپیاں پہنے پارسی آتش پرست اور سیاہ لباس زیب تن کیے پورنگالی خوبصورت خواتین اور شور مچا کر بات کرتے ہوئے وحشی چہروں والے چینی، برہمانی اور ملیشیا کے لوگ، باریک پگڑیاں پہنے ہوئے کوچی، گجراتی اور بڑے بڑے امامہ سر پر لپیٹے افغانی اور سندھی اس شہر کی سڑکوں پر دکھائی دیتے ہیں۔

الغرض، اوراق تاریخ کے بے نظیر شہر باہل تک دنیا کا کوئی بھی شہر بنی نوع آدم کی مختلف اقسام کو اس حد تک یکجا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ (صفحہ ۱۷)

احمد حمادی ممبئی سے نکل کے مختلف شہروں سے گزرتے ہوئے جب اُدے پور پہنچتے ہیں تو اُن کی حیرت میں بے تحاشا اضافہ ہوتا ہے۔ وہ اس کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

احمد آباد سے نکلنے کے بعد کاروان کے ساتھ خطرناک علاقوں اور دو پہاڑوں کے درمیان گزرگا ہوں سے ہوتے ہوئے پندرہ دن بعد جب مسافر، میواڑ کے دارالحکومت اُدے پور پہنچتا ہے تو اُسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اجنبی اپنے ہاتھوں میں ایک بہت ہی عمدہ منظر کی تصویر پکڑے اُسے بے انتہا حیرانی اور شوق سے دیکھ رہا ہو۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس خطہ زمین پر اس طرح کا ایک شہر بھی موجود ہوگا۔

پہلی نظر ہی میں اس شہر میں شاندار محلات اور مندر اور ان کے ساتھ منسلک جنگلوں کی طرح بہت وسیع و عریض باغات بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ان کی دوسری جانب ایک دوسرے سے گلے ملتی ہوئی چھوٹی چھوٹی برجیاں اور بنگلوں پر مشتمل منزل بہ منزل بلند ہونے والی ایک اہرام نما پہاڑی نظر آتی ہے جو ایسے لگتی ہے گویا اس دنیا کی نہیں جنوں پر یوں کی دنیا کی ہے۔ شہر مذکور پہاڑوں کے نیلگوں دامن میں آباد ہے اور آنکھوں کو چند ہیادینے والے سفید سنگ مرمر اور سورج کی شعاعوں سے چمکنے والے بے شمار اور بڑے بڑے محلات اور شہزادوں کی حویلیوں سے مزین ہے۔ اس بحر انگیز اور پرکشش شہر کا تعارف قلم اور سیاہی سے کرنا بالکل ناممکن ہے۔ (صفحہ ۲۴)

ہم شہروں اور عمارتوں کی مدح و ثنا سے نکلنے ہیں تو احمد حمی کے ”ناقابل یقین ہندستان“ کے ایک دوسرے پہلو سے روشناس ہوتے ہیں۔ وہ ہے ہندستان کے مذاہب اور غیر مسلموں کی عبادات اور عادات و رسوم! جیسا کہ ہم نے بتایا ہے، احمد حمی نہ صرف عالم دین اور عالم فقہ تھے بلکہ مغربی زبانیں اور جدید علوم سے بھی واقف تھے۔ بعض یورپین سیاحوں کی طرح اُن کی شخصیت میں نہنگ نظری کا عنصر نظر آتا ہے نہ کسی طرح کا احساس برتری۔ وہ ہندستان میں جو کچھ دیکھتے ہیں اسے بالکل ہی غیر جانبداری سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیگر مذاہب کے بارے میں معلومات فراہم کرنے یا اُن کا تجزیہ کرنے میں بھی اُن کا یہی رویہ قائم رہتا ہے۔ مثلاً، چاہے یہ ہندوؤں کا اپنے مردوں کو جھلانے کا بیان ہو یا بنارس جیسے مقدس شہر میں اُشان کر کے تطہیر بدن کرنے کی تشریح ہو یا پارسیوں کا اپنے مردوں کو چیلوں کی نذر کرنے کا طریقہ، وہ ان تمام باتوں کو معلوماتی انداز میں کسی تعصب کا شکار ہوئے بغیر بیان کرتے ہیں اور گاہے بے گاہے اُن کی داد بھی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوؤں کی مذہبی رواداری انہیں بہت پسند ہے اور اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

آباد دنیا میں اپنی عبادت گاہوں میں آزاد خیالی اور رواداری سے دوسروں کے ساتھ پیش آنے والی ہندوؤں جیسی کوئی دوسری قوم موجود ہوگی؟ ہندوؤں کے سوا وہ کوئی قوم ہو سکتی ہے جو اپنے مندروں میں پوجا کرتے ہوئے کسی اجنبی کو کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھنے کی اجازت دے جس طرح بنارس جیسے مشہور اور مقدس شہر میں ہندو خود پوجا کرتے ہوئے اجنبیوں کو اپنی عبادتی رسوم کی بجا آوری دیکھنے دیتے ہیں۔ (صفحہ ۴۱)

احمد حمدی ہندوؤں کی مذہبی رواداری کے بارے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے جگہ ہندوؤں کے بھگوان شیوا کا مقام اور ہندوؤں کی مقدس عبادت گاہ ہونے کے باوجود، ہجوم کے ایک طرف ایک پروٹسٹنٹ مشنری خود ایک کرسی پر بیٹھ کر ہندو کو اپنے سامنے بٹھا کر اُسے عیسائی بنانے کی کوشش کرتا تھا۔

مجھے اُس کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ چیخ مار مار کر کہتا تھا کہ تم بت پرست لوگ، پتھروں کی کان سے پتھر لا کر سنگ تراشوں سے ان کے مجھے بنواتے ہو اور انہیں اپنے گھروں کی دیواروں سے چسپاں کر کے ان بھرے اور گونگے پتھروں کی پوجا کرتے ہو۔ وہ بڑے جرأت مند انداز میں یہ باتیں کہہ رہا تھا لیکن اُس پاس کھڑے افراد میں سے کوئی بھی آواز نکالے بغیر کامل صبر و تحمل سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ ہاں، یہاں اِس امر کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مشنری کی اِس حیرت انگیز بلند وصلگی اور بے خوفی کا واحد سبب انگریزی حکومت کا ہندستان پر قبضہ اور غلبہ ہے۔ (صفحہ ایضاً)

اِس طرح سفر نامے کے مختلف صفحات پر ہندو اور دیگر مذاہب کے متعلق کافی معلومات پائی جاتی ہیں جو بہت دلچسپ اور پُرکشش ہیں۔

احمد حمدی کے ”ناقابل یقین ہندستان“ کا ایک اور پہلو جو انہیں متاثر کرتا ہے وہ خاص طور پر مسلمانان ہند اور عام طور پر تمام ہندستانی مذاہب کے لوگوں کے ترکوں اور خلافت عثمانی سے محبت اور بھائی چارے کا تعلق ہے۔ اِس مہر و محبت اور برادرانہ تعلقات کا مظاہرہ عثمانی وفد کے ممبئی پہنچنے ہی سامنے آ جاتا ہے اور دورانِ سفر جگہ جگہ خود کو دکھاتا ہے، یہ شرط ہے کہ انگریزی حکام اس کی اجازت دیں۔ احمد حمدی کے بیانات سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ عثمانی اور اہل ہند کے دوستانہ تعلقات اور روابط سے انگریز حکام ناراض اور پریشان تھے اور حد امکان ان کے کی راہ میں سدِ باب بننے کی کوشش کرتے تھے۔

جب عثمانی وفد ممبئی پہنچتا ہے تو مسافر خانے کے سامنے وفد کا بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا جاتا ہے۔ انگریز حکام فوراً ہی اس کے خلاف اپنا رد عمل دکھانے سے گریز نہیں کرتے۔ احمد حمدی اِس استقبال کا ذکر یوں کرتے ہیں:

الغرض، ہمیں بڑے اعزاز و کمال کے ساتھ مذکور بندرگاہ سے پہلے سے تیار شدہ مسافر خانے پہنچا دیا گیا۔ جب ہم نے سڑکوں سڑک بھرے ہوئے مقامی اہل اسلام کو دیکھا تو ہم سے اُن کی محبت اور مذکورہ علاقے کی لطافت سے حاصل شدہ شادمانی نے بحری جہاز پر اٹھائی ہوئی ہماری چند روزہ مشکلات ساری کی ساری بھلا دی۔ بندرگاہ پہنچتے ہی اُن کی طرف سے ہماری ہندستان آمد پر تشکر نامے پیش ہونے لگے۔ اُن لوگوں کی

خواہش تھی کہ اکٹھے ہم لوگوں سے ملنے آئیں لیکن لوکل گورنمنٹ کی ناراضگی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے صرف چند افراد کو ملاقات کی اجازت دی، پھر بھی شام تک کافی اصحاب سے ملاقات ہوئی گئی۔ (صفحہ ۱۴)

اراکین وفد کو چونکہ انگریزی گورنمنٹ کی ناراضگی کا خدشہ لاحق ہوا تھا، جیسا کہ سفر نامے سے واضح ہوتا ہے، اس لیے جمعہ کی جہاز ادا کرنے کے لیے وہ لوگ شہر کی ایک نظر سے دور اور کم جماعت مسجد ڈھونڈ کر اُس میں گئے۔ لیکن ممبئی کے مسلمان اُن کی مسجد میں آنے کی خبر سنتے ہی اُن سے ملنے کی خاطر جوق در جوق وہاں جا پہنچے اور وفد کے ارکان نماز کے فوراً بعد ہی مسجد سے سیدھے مسافر خانے واپس آ گئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسافر خانے لوٹنے پر ان کا یہ خدشہ صحیح نکلتا ہے:

واقعاً ہمارا خدشہ صحیح نکلا۔ رہائش گاہ میں پہنچنے کے بعد شہر کے میسر کچھ اور ملازموں کے ہمراہ آ کر کہنے لگا کہ آج رات آپ لوگ ممبئی میں نہیں ٹھہریں گے۔ سفر کے اخراجات اور دیگر ضروریات حکومت کی طرف سے ممبیا کی جائیں گی۔ اور راستے میں ضرورت کے وقت کام آنے کے لیے مہماندار کی حیثیت سے ایک افسر ہمارے ساتھ کر دیا گیا۔ (صفحہ ۱۵)

شام کے وقت ممبئی سے ریل گاڑی میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ ریل گاڑی رات کو پوری سرعت سے چلتی رہی اور صبح کے وقت ہم نے دیکھا کہ ہمارے آس پاس ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے تو ہم اپنے سفر سے لطف اندوز ہونے لگے۔ سارے دن کے سفر کے بعد ہم تقریباً رات کے تین یا چار بجے جبل پورہ پہنچے تو دیکھا کہ ہم ہزاروں آدمیوں کے گھیرے میں ہیں۔ چونکہ ہمارے ہمراہ آنے والے انگریز افسر نے اس اسٹیشن پر ہماری آمد کی خبر پہلے ہی تار کے ذریعے بھیج دی تھی، لہذا آس پاس کے قصبات اور گاؤں کے یہ لوگ محبت اور شوق کے مارے ہم سے ملنے آئے تھے۔ واقعاً اس طرح کے منظر مقامی حکومت کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ شاید اسی وجہ سے بعد پشاور تک گاڑی جن جگہوں پر بھی رکی، کوئی فرد بھی نظر نہ آیا۔ اکثر اوقات ریل گاڑی اسٹیشنوں پر تھوڑی دیر رکتی اور پھر عازم راہ ہوتی، اور جلد ہی ہریالی کا کوئی نوش نظر نہ آتا۔ الغرض، خاک و غبار میں لپٹے اور گرمی سے بے حال ہم لوگ کوئی عصر کے وقت الہ آباد پہنچے۔ یہ ہماری تیسری منزل تھی۔ (صفحہ ۳۶)

جیسا کہ اوپر دی ہوئی معلومات سے پتا چلتا ہے، احمد حمّی کو ”ناقابل یقین ہندستان“ کا سب کچھ پسند ہے: ”آب و ہوا، شہر، قصبے، گاؤں اور سب سے بڑھ کر اہل ہند کی ترکوں سے محبت۔ اگر کوئی چیز نا پسند ہے تو یہ ”انگریزوں کا عثمانیوں کے ساتھ دوغلہ پن“ ہے۔ کیونکہ اُن دنوں انگلستان اور عثمانیوں کے مابین دوستانہ تعلقات کے علی الرغم اور دونوں ملکوں کے اکٹھے روس سے محاذ آرا ہونے کے باوجود، انگریزی حکام عثمانی وفد کا اہل ہند سے ملنا اور ان سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا برداشت نہیں کرتے ہیں اور اس کو روکنے کے لیے ہر ممکن

کوشش کرتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ عثمانی وفد کو ناکام بنانے کی کوشش بھی۔ اسے احمد حمادی ایک سفیر کی حیثیت سے ڈپلوماٹیک زبان میں یوں بیان کرتے ہیں:

جیسا کہ روالپنڈی میں طے ہوا تھا، ہوتی مردان میں مقامی حکومت کی معرفت اُن علاقوں کی صورتحال سے واقف چند دوست ڈھونڈ کر سوات کے حاکم خواجہ محمد خان سے بذات خود آخوند صاحب اور دیگر خانان سوات کے نام سفارشی اور اس وفد کے مقاصد کی تفصیل فراہم کرنے والے خطوط حاصل کیے گئے جن میں لکھا گیا تھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانے والے ہیں۔ ہم عازم راہ ہوئے۔ لیکن ایک دن پہلے خواجہ محمد خان نے ہی حکومت کی ایما پر آخوند صاحب کو ایک خط لکھ کر اپنے آدمی کے ہاتھ بھجوا دیا (کاش نہ بھیجتا!)۔ انگریزی حکام کا فرستادہ آدمی اس امر کا ثبوت تھا کہ انگریز حکومت کی نظر میں ہماری کیا قدر و منزلت ہے۔ یہ آدمی وہاں جا کر جن صاحب کے یہاں مہمان ٹھہرا تھا، اس آدمی نے ان کو اور آخوند صاحب کو یہ بات بتائی تھی کہ انگریز ہمیں بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان اصحاب نے یہ سوچا تھا کہ انگریز خواہ مخواہ کسی پر توجہ نہیں دیں گے۔ اس لیے ان کو ہم پر شک ہوا تھا اور دوسری طرف ان کو یہ غلط فہمی بھی ہو گئی تھی کہ ہماری سوات آمد ضرور انگریزوں کی کوئی سازش ہوگی۔ اس بات نے آگے چل کر ہمارے کام میں بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی“ (صفحہ ۱۲)۔

مندرجہ بالا سطور میں عثمانی وفد کے سفر ہندستان، سوات اور افغانستان کی روداد احمد حمادی آفندی کی زبانی مختصر اُپیش کی گئی ہے۔ دراصل ۲۸۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں پونا، دکن، اڈے پور، اجیر، کولکوتا، بہار، راجپوتانا، ملتان، وغیرہ بہت سے شہروں کا تفصیلی ذکر ہوا ہے۔ اور کچھ شہروں کی ہاتھ سے بنی تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔ برصغیر سے متعلق مفصل اور مستند معلومات فراہم کرنے والی یہ ترکی کی اپنے طرز کی پہلی اور منفرد کتاب ہے۔ اور ایک باعتبار سفیر کے چشم دیدہ واقعات پر منحصر ہونے کی وجہ سے تاریخی لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ □

حوالہ جات

1. "This research project has been supported by Scientific Research Projects Coordination Unit of Istanbul University. Project number 22017."
2. Kemal Beydilli, Sefâretnâme-Osmanlı'da," Türkiye Diyanet Vakfı İslâm Ansiklopedisi, Volume: XXXVI, Istanbul 2009, pp. 289-294.
3. Menderes Coskun, "Setahatnâme-Türk Edebiyatı," Türkiye Diyanet Vakfı İslâm Ansiklopedisi, Volume: XXXVII, Istanbul 2009, pp. 13-16.

4. Azmi Ozcan, Pan-Islamizm: Osmanli Devleti-Hindistan Muslumanlari ve Ingiltere (1877-1914), Istanbul 1992, p. 67.
5. Cezmi Eraslan, II. Abdulhamid ve Islam Birligi, Istanbul 1992, pp. 321-322; Azmi Ozcan, *ibid.*, pp. 161-166.
6. Sirvanli Ahmed Hamdi Efendi, Seyahatnâme-Hindistan. Svat ve Afganistan, (Edited by Fatma Rezan Hürmen), Istanbul 1995, pp. 5-6.